اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ۲، مسلسل شمارہ:۳۷۲، سال ۲۰۲۴ء

پاکستانی پنجابی افسانے میں جنسیت کی روایت

احمد شہزاد، پی ایچ ڈی
لیکچرار پنجابی، گورنمنٹ اسلامیہ گریجوایٹ کالج، سول لائنز، لاہور

TRADITION OF SEXUALITY IN PAKISTANI PUNJABI SHORT STORIES

Ahmad Shahzad, PhD
Lecturer in Punjabi
Govt. Islamia Graduate College, Civil Lines, Lahore

Abstract

The concept of sexuality has been present since ever in all literatures. No literature or art in the world is devoid of sexuality. In literature, the psychological and emotional aspects of sex are particularly focused. The models of sexuality can be vividly seen in English, Arabic, Persian, and Urdu literatures. There are many examples of sexual content in Punjabi literature. In Punjabi short stories, sexuality is particularly discussed in its emotional, psychological, romantic, and Marxist perspectives. In the research paper, all elements of sexuality in Punjabi short stories are discussed and important aspects of sexism are elaborated.

Keywords:
Urdu, Punjabi, Short Stories, Sexuality, Tradition

جنس کا لفظ اپنے اندر مختلف مفہوم رکھتا ہے، جنس گرامر کی رو سے مونث ہے۔ ذات، نوع، جماعت، چیز، شے، اثاثہ، نسل خاندان اور مذکر یا مونث کے معنی رکھتا ہے۔(۱) جہاں تک جنس کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے یہ لفظ اپنے اندر معانی و مقاصد کا ایک بیکراں سمندر سمیٹے ہوئے ہے جس میں بنی نوع انسان کی تاریخ آغاز سے اختتام تک موجود ہے۔ جنس کے لیے انگریزی زبان میں لفظ سیکس (Sex) آتا ہے جو بہ طور اسم استعمال ہوتا ہے لیکن سیکس دراصل لاطینی لفظ ہے۔ اردو اور پنجابی میں اس کا مترادف جنس ہے۔ یہ ایک عربی لفظ ہے: "الجنس" کا مطلب ہے: مختلف انواع پر صادق آنے والی ماہیت۔ جیسے حیوانیت، کہ وہ انسان اور گھوڑے کے لیے جنس ہے۔ ج: اجناس۔(۲) کچھ ناقدین کے نزدیک پنجابی اور اردو زبان میں روایتی طور پر "جنس" کا لفظ انگریزی لفظ "Sex" کے مترادف و متبادل کی حیثیت سے مستعمل نہیں رہا۔ اس کے لغوی مفہوم میں تنوع تو نظر آتا ہے مگر وسعت اور گہرائی نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر فرہنگ آصفیہ میں لفظ جنس سے مراد "ذات، نوع اور صنف ہے۔"(۳) اسی طرح نسیم اللغات اور فیروز اللغات وغیرہ میں بھی کم و بیش یہی معنی دیے گئے ہیں اور اس لفظ کے وسیع تر استعمال کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا جب کہ انگریزی کی تمام اہم لغات میں لفظ "Sex" وسیع تر مفہوم میں لیا گیا ہے۔(۴) مثلاً Webster's Dictionary میں لفظ "Sex" سے مراد ہے:

> The Character of being male or female all the attributes by which males and females are distinguished any thing connected with Sexual gratification or preduction or the urge for these esp, the attraction of those of one Sex for those of other.(5)

پنجابی اور اردو ادب میں جنس کا مفہوم انگریزی لفظ "سیکس" سے قدرے مختلف ہے۔ ابتدا میں جنس سے مراد اپنا مقصد حاصل کرنا یا پانا تھا۔ اہل قلم نے اسی لفظ "جنس" کو شہوانیت اور جنسی خواہشات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ ادب داخلی و خارجی حالات کا مظہر ہے مگر ادب کی تخلیق قلبی واردات اور احساسات و جذبات کے ابھرنے سے ہوتی ہے۔ ادب میں جنس کا تصور ہمیشہ سے موجود ہے خواہ وہ کسی معاشرے کا ادب ہو۔ "دنیا کا کوئی ادب یا آرٹ جنسی موضوع سے خالی نہیں یہاں تک کہ عہد عتیق کے ادبی شاہ کار بھی جنس سے خالی نہیں۔"(۶)

ادب جنس کے حیاتیاتی فعل کو پیش نہیں کرتا۔ یہ کام تو جنسیات پر لکھی گئی سائنسی کتابوں کا ہے لیکن جہاں تک جنس کے نفسیاتی اور جذباتی پہلو کا تعلق ہے ادب کو اس سے دل چسپی ہے۔

فرائیڈ (۱۸۵۶ـ۱۹۳۹ء) نے ادب و فن کو قلب ماہیت اور ارتفاع قرار دیا ہے۔ ادب جنسی جذبے کا ہی مظہر ہے۔(۷) ادب میں جنسی پہلو پر زور دینے کے دو اسباب خصوصاً قابل ذکر ہیں: ایک یہ کہ ادیب اپنی انفرادی جنسی گھٹن کا شکار ہو کر اپنی تخلیق میں اس کی تلافی کر کے لذت پانے کے درپے ہوتا ہے۔ دوم وہ اپنے کلچر و تہذیب میں پائی جانے والی ان تمام برائیوں اور کوتاہیوں کو پیش کرنے کی سعی کرتا ہے جو جنسی ناآسودگی کی وجہ سے وجود میں آکر سماج کو ایک کثیف فضا میں دھکیل دیتی ہیں۔ تاریخ کے مطابق جنس ابتدا سے ہی عالی ادب کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔(۸) جہاں تک تخلیق سے جسم کا تعلق ہے اس پر ہمیشہ جنسی جذبے کا تسلط نسبتاً زیادہ رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جنسی جذبہ کا نہایت گہرا تعلق ہماری پانچویں حسیات سے ہے اور یہی حسیات ادب کی تخلیق میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ لہٰذا وہ جب ادب کی تخلیق میں کام کر رہی ہوتی ہیں تو جنسی جذبہ انھی کے ذریعہ ادب میں بھی منتقل ہو جاتا ہے اور فن کے جسم کی تعمیر کرتا ہے۔(۹) اس حوالے سے Lord David (۱۹۰۲ـ۱۹۸۶ء) لکھتا ہے:

> Whole libraries have been written about sex. Infact and fiction, poetry and prose and current literature is endlessly concerned with it.(10)

جہاں تک فحش ادب کا تعلق ہے اس کے لکھنے اور پڑھنے والے ہمیشہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ فحش نگاری کی سب سے بڑی وجہ وہ لوگ ہیں جو جنسی مریض کہلاتے ہیں۔ چوں کہ یہ لوگ جنس کو عملی طور پر نبھانے میں ناکام ہوتے ہیں اور اپنی تشنہ لب خواہشات کو عریاں تصویریں دیکھ کر اور فحش ادب پڑھ کر پورا کرتے ہیں۔ یونانی ادب کا بہ غور مطالعہ کریں تو فحاشی کی مفصل روایت سامنے آتی ہے۔ سقراط اور ارسطو (۳۲۲م۔۳۸۴ق م) کی تخلیقات میں ہم جنسی محبت کا برملا اظہار ملتا ہے۔ قدیم سنسکرت میں بھی جنسی مضامین ملتے ہیں جن کے ترجمے انگریزی، عربی اور فارسی میں بھی ملتے ہیں۔ ان میں جنس لطیف، شادی، مرد و عورت، دولہا، دلہن، لذت النساء کے حوالے سے تذکرے ملتے ہیں۔ قدیم مصری، یونانی، ایشیائی اقوام سبھی جنس کو اپنے مطابق ڈھالتے تھے اور جسمانی حظ اٹھاتے تھے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ابتدائے زمانہ سے ہی ناولوں، ڈراموں، افسانوں، داستانوں، مضامین اور شعر و شاعری میں فحش نگاری سے لذت محسوس کی جاتی رہی ہے۔

شخصیت کی صحیح تفہیم و تجزیے کے سلسلے میں انسانی علوم کے ماہرین اور خاص طور پر ماہرین نفسیات نے انسانی جبلتوں اور ان سے وابستہ جذبات کا بڑائی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان جبلتوں اور

جذبات میں سب سے اہم جبلت جنس "Sex" اور اس سے وابستہ قوی جذبات ہیں۔ ان جذبات کی افادیت اوراہمیت کو ہر دور میں محسوس کیا گیا ہے۔ چناں چہ مختلف علوم وفنون میں اس کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ادبیات میں جنس اوراس سے وابستہ جذبات کی حسین پیرائیوں میں عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے رُبع آخر میں انسانی زندگی کے اس قوی ترین جذبے کی اہمیت کو خاص طور پر اُجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے اور انسانی زندگی میں اس کے ناگزیر عمل دخل کی بنیاد پر اس کو معروضی اور سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس سلسلے میں مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ(۱۸۵۶۔۱۹۳۹ء) کی کاوشیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس موضوع پر ان کی دو اہم کتابیں: *Interpretation of Dreams* اور *A Contributuion to the Theory of Sex* منظر عام پر آئیں۔ ان کتابوں میں فرائیڈ نے انسانی زندگی کی اس حیوانی خواہش اوراس سے منسلک جذبات کی غیر معمولی اہمیت پر معروضی انداز میں خامہ فرسائی کی۔ ان کا خیال ہے کہ یہ آتشیں جذبہ ہے جو ہمیشہ اظہار کی راہیں ڈھونڈتا ہے۔(۱۱) فرائڈنے انسان کے جنسی ہیجان کو Libido انسانی نفس میں پائی جانے والی ایک ایسی قوت ہے جو خود کار اور خودغا ہے۔ وہ جنسی ہیجان کو Inborn Quality قرار دیتے ہیں۔ فرائڈ لذت آفرینی کو "Sex" کانام دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر وہ چیز جس سے لذت یاحظ حاصل ہویاجو مسرت ولذت کاباعث بن جائے سیکس ہے۔ اس طرح وہ جنسی جذبے کے ارتقا کی چار منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں: عہد شیر خواری، عہد لڑکپن، عہد شباب اور عہد بلوغت۔

جس طرح روسی اشتراکی لیڈر لینن(۱۸۷۰۔۱۹۲۴ء) کے نظریہ انقلاب اورمشہور جرمن اشتراکی کارل مارکس (۱۸۱۸۔۱۸۸۳ء) کے عقیدہ اشتراکیت نے بیسویں صدی کے عالمی ادب کو متاثر کیا عین اسی طرح مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سگمنڈ فرایڈ(۱۸۵۶۔۱۹۳۹ء)، یونگ (۱۹۴۳ء) اور ایڈلر (۱۹۰۲۔۲۰۰۱ء) کے تصور جنسیت نے بھی ادب پر گہرے نقوش چھوڑے۔ انگریزی ادب میں فرایڈ کا سب سے زیادہ نمایاں اثر ڈی۔ ایچ الارنس(۱۸۸۵۔۱۹۳۰ء) کی ناول نگاری پر پڑا۔ جس کے ناولوں Sons& Lovers (1914)، The Rainbow (1915)، Lady Chaterley's Lover، The Women in Love اور The Lost Girl میں فرائیڈ کے تحلیل نفسی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح انگریزی ادب میں رچرڈسن(۱۶۸۹۔۱۷۶۱ء)، ڈبلو۔ایل جارج(۱۸۸۲۔۱۹۲۶ء)،

اینڈورماویل (۱۶۲۱۔۱۶۷۸ء)، جان بائرن(۱۶۲۱۔۱۶۷۸ء)، کیٹس(۱۷۹۵۔۱۸۲۱) وغیرہ کی تخلیقات میں بھی جنس نگاری کے نمونے موجودہیں۔ اسی طرح عربی ادب میں شہزادہ امرؤالقیس، النابغہ الذبیانی اور عنترہ بن شداد اور لعبسی وغیرہ نے جنسی جذبات کا اظہار عشق مجازی کے پیرائے میں کیا ہے۔ بیسویں صدی میں ایران کے ادب نواز حلقے میں یورپی ادب سے تراجم کا ذوق وشوق پیدا ہوا اور یونانی، لاطینی، فرانسیسی، جرمنی، انگریزی اور روسی ادب کے تراجم کی ایک خاص تعداد وجود میں آگئی اس طرح مغربی تصورات ایرانی ذہن پر بڑی کامیابی کے ساتھ اثر انداز ہوئے خاص طور پر مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کے تصورات شاعری اور نثر میں داخل ہوئے۔ کلاسیکی فارسی ادب میں سعدی شیرازی(۱۲۱۰۔ ۱۲۹۲ء)، حافظ شیرازی (۱۳۲۵۔۱۳۹۰ء)، عمر خیام(۱۰۴۸۔۱۱۳۱ء)، فردوسی(۹۴۰۔۱۰۲۰ء)، جلال الدین رومی (۱۲۰۷۔۱۲۷۳ء)، اور جامی(۱۴۱۴۔ ۱۴۹۲ء) کے ہاں جنسیت کا اظہار ملتا ہے۔ جب کہ جدید فارسی شاعری میں فروخ فرخزاد(۱۹۳۴۔۱۹۶۷ء)، محمد علی اسلامی، فریدون کار، ناصر نظمی، ہوشنگ ابتہاج سایہ (۱۹۲۸۔ ۲۰۲۲ء)اور عشقی کے کلام میں جنسیت کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ فارسی افسانے کی بات کریں تو جمال زادہ، صادق ہدایت(۱۹۰۳۔۱۹۵۱ء)، صادق چوبک (۱۹۱۶۔۱۹۹۸ء)اور جلال آل احمد (۱۹۲۳۔۱۹۶۹ء)نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو جنس نگاری کے رجحان کا زندہ ثبوت ہیں۔

پنجابی اور اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات رہے اس لیے ان زبانوں میں لکھے گئے افسانوں میں بھی جنسی محرکات کا اظہار معاشرے اور سماج کے دائرہ کار میں رہ کر کیا جانے لگا۔ اردو افسانے کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے مگر جنسی موضوعات کو پیش کرنے والے بنیادی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم (۱۸۸۰۔۱۹۴۳ء)، سلطان حیدر جوش(۱۸۸۶۔۱۹۴۶ء)، نیاز فتح پوری(۱۸۸۴۔۱۹۶۶ء)، مجنوں گورکھپوری(۱۹۰۴۔۱۹۸۸ء)، سجاد ظہیر (۱۸۹۹۔۱۹۷۳ء)، پروفیسر احمد علی(۱۹۱۰۔ ۱۹۹۴ء)، ڈاکٹر رشید جہاں (۱۹۰۵۔ ۱۹۵۲ء)، کرشن چندر(۱۹۱۴۔۱۹۷۷ء)، سعادت حسن منٹو(۱۹۱۲۔۱۹۵۵ء)، عصمت چغتائی(۱۹۱۵۔۱۹۹۱ء)، راجندر سنگھ بیدی(۱۹۸۴۔۱۹۱۵ء)، ممتاز مفتی(۱۹۰۵۔۱۹۹۵ء)، احمد ندیم قاسمی(۱۹۱۶۔ ۲۰۰۶ء)، بلونت سنگھ (۱۹۲۱۔۱۹۸۶ء)وغیرہ جیسے نئے اور پرانے افسانہ نگار شامل ہیں۔

پاکستان پنجابی افسانے میں جنسیت کے موضوع کو ٹریٹ منٹ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ موضوع چار حصوں میں تقسیم ہوا نظر آتا ہے۔(الف) وہ افسانے جن میں جنسی جبلّت کو جذباتی تلذّذ کے

حوالے سے دیکھا گیا ہے اور پورے آدمی کی بہ جائے صرف نچلے دھڑ کی نمائندگی کی گئی ہے۔(ب) جن میں کسی ایک پہلو یا پورے ماحول کا نفسیاتی پس منظر بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔(ج) جن میں جنس کو مارکسی فلسفے کی ایک ذیلی شاخ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔(د) جن میں کسی مثبت نتیجے کے حوالے سے جنس کے روحانی پہلوؤں کی نقاشی کی گئی ہے اور اس طرح منفی تجربات کے منفی اثر سے مثبت سبق حاصل کرنے کے عمل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پاکستانی پنجابی افسانے میں اس موضوع کے ابتدائی نقوش نواز (۱۹۳۵۔۱۹۹۵ء) کے افسانوں ''شام دا پہلا تارا''، ''چن دی چاننی'' اور ''شیریا وے شیریا'' میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے لیے یہ جواز تلاش کیا گیا کہ عام بھوک کی طرح جنس بھی ایک بھوک ہے چناں چہ جس طرح بھوک اور غربت افسانوں کے موضوعات ہیں اسی طرح افسانوں میں اس بھوک کا اظہار بھی ضروری ہے۔ نواز نے جنس کو اپنے افسانوں کا موضوع ضرور بنایا ہے لیکن نہ تو وہ خود اس کی بھول بھلیوں میں گم ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو گم ہونے دیتے ہیں۔ انہوں نے جنس کے غلط استعمال کو معاشرتی کروودھ اور برائی کے طور پیش کیا ہے۔ جنسی حوالے سے نواز کے افسانوں میں ایک دکھ، درد اور کرب کی موجودگی تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے قاری کو مثبت سبق دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔

مہر کا چیلوی کے افسانے ''تیجی واری'' میں نئی تہذیب اور شہری ماحول میں خراب ہونے والی ایک لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو دو دفعہ پاگل خانے سے ہو آئی ہے اور تیسری دفعہ پاگل خانے جانے سے پہلے سوانح عمری لکھ رہی ہے کہ کسی طرح انگریزی ناولوں نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے اور جنس ایک مرد کی صورت میں آ کے کس طرح اس کے باطن کی آگ کو راکھ بنا گئی۔ اسی طرح عمر غنی کے افسانے ''موم جامہ'' میں بتایا گیا ہے کہ جنسی برائیوں کی اتنی برسات لگی ہوئی ہے کہ جب تک بندے کے پاس اخلاقی اقدار کی برساتی نہ ہو چھٹّے کو اس برائی کے مینہ سے بچانا کٹھن ہے۔ عبدالمجید بھٹی (۱۹۰۲۔۱۹۷۶ء) کے افسانے ''جوانی دے پیر'' میں البتہ ایک پوری کہانی بیان کی گئی ہے اور ایک مناسب انداز اختیار کر کے اصلاح کی گنجائش نکالی گئی ہے۔ ''بکو'' اپنے خاوند کو چھوڑ کر ''نوراں'' کے شوہر سے جنسی تعلق جوڑنے کی کوشش کرتی ہے لیکن ان دونوں کی مشترکہ سہیلی فاطمہ صورتِ حال کو سنبھال لیتی ہے اور ایسا ڈرامہ رچاتی ہے کہ ''بکو'' شرمندگی کے ساتھ واپس اپنے خاوند کے پاس چلی جاتی ہے۔ سلیم خان گمی کے افسانے ''بیوقوف انسان'' میں بھی دو بچوں کی ''ماں فاخرہ'' اور اُس کے دوست ''مقصود'' کے حوالے سے بھی ایسی ہی صورت حال پیش کی گئی ہے

پر اس کا اختتام مختلف طریقے سے ہوتا ہے یعنی غلط قیاس کی وجہ سے "فاخرہ"، "مقصود" کو لے کر ایک ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں مقصود بڑی آسانی سے اس کی عزت پر ہاتھ ڈال سکتا تھا پر مقصود خاموشی سے اُسے واپس لے آتا ہے۔ نیچے کار میں بیٹھ کر جب فاخرہ اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ مقصود تم بڑے عظیم انسان ہو تو مقصود فوراً جواب دیتا ہے کہ میں عظیم انسان نہیں بلکہ عظیم بے وقوف ہوں کیوں کہ میں نے اپنے وقت اور روپے کی قیمت وصول نہیں کی۔ اسی طرح رفعت کے افسانے "گھمن گیری" میں بھی ایسی کہانی ہے جو ہماری فکر اور سوچ کے کئی مثبت دروازے کھول دیتی ہے۔ جس طرح روٹی کی بھوک، پانی یا باتوں سے نہیں اُترتی اُسی طرح جسم کی بھوک کا حل زیور کپڑوں سے نہیں نکلتا۔ جو لوگ نئی نئی شادی کے بعد سالوں کے لیے دوسرے ملکوں میں دھن دولت اکٹھی کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ کہیں ان کی کھاتی پیتی "کوثری" جسم کی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کے اپنی چمکتی حویلی چھوڑ کر ہمسائے کی اندھیری ڈیوڑھی میں نہ چھپ جائے اور اگر اس طرح ہو گیا تو پھر "کوثری" سے زیادہ قصور اس "شکیل" کا ہو گا جو اُسے خواب دکھا کر لمبے عرصے کے لیے کاغذ اور چمکیلی دھاتیں اکٹھی کرتا رہا پر اُس کے خواب میں منفرد اور حقیقت کے رنگ بھرنے سے بے خبر رہا۔(۱۳)

جنسی کج روی کے حوالے سے ایک واقعہ حسین شاہد کے افسانے "چبارے دی اٹ" میں بھی ملتا ہے، جس میں "تاجاں" کی "بھجے" کے ساتھ شادی تو ہو جاتی ہے لیکن "بھجا" اس کے جوڑ میل کا نہیں۔ تاجاں حسن کا شاہکار اور ملنسار ہے چناں چہ "رَکھے" سمیت گاؤں کا ہر لڑکا اُس کے آگے پیچھے ہے۔ ایک دن "مراد" "رَکھے" کو ولن کا روپ دے کر تاجاں کو بھگا کر لے جاتا ہے جو ایک مہینہ اس کے ساتھ گزارنے کے بعد پھر اپنے خاوند بھجے پاس واپس آ جاتی ہے۔ مرزا شبیر بیگ ساجد کے افسانے "فریب" میں البتہ اس سے مختلف صورت حال دکھائی دیتی ہے یعنی ایک بوڑھا اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے ایک جوان لڑکی کے ساتھ دوسری شادی کر لیتا ہے جب کہ "نسرین" "منشی" کی تصویر کے ساتھ اپنا دل خوش کر لیتی ہے۔ غلام مصطفیٰ بسمل (پ:۱۹۵۲ء) کے افسانے "ٹٹیا تارا"، "ہسدیاں سولاں" اور "بھیالی" جنسی جرائم اور جنسی بے راہ روی سے جنم لینے والے اسی طرح کے مسائل سے متعلق ہیں جن کے آخر میں منفی تجربات سے مثبت سبق حاصل کرنے کے عمل کو اُبھارنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو کی نمائندگی کی گئی ہے۔ "بھیالی" ان نوجوانوں کے لیے عبرت کا ایک درس ہے جو شادی سے پہلے دوسروں کی ہونے والے بیویوں

سے اچھا برا کرتے ہیں اور اپنی ہونے والی بیوی بارے خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ تو نیک پاک ہی ہو گی۔ "شیدا" مال دار ہے اور روزانہ اپنے ڈیرے پر نئی سے نئی لڑکی لاتا ہے۔ ایک شام وہ خود اور اُس کا دوست "فندی" کے جسم کے ساتھ کھیلتے ہیں جو صبح سویرے نوٹوں کی ایک گتھی لے کر گھر چلی جاتی ہے۔ کچھ وقت کے بعد شیدی کی ماں اپنے بیٹے کی شادی اپنی بھانجی "ریشماں" کے ساتھ کر دیتی ہے لیکن جب وہ پہلی رات گھنڈ اُٹھا کے دیکھتا ہے تو اس کا دماغ چکرا جاتا ہے کیوں جو یہ "فندی" ہی تھی جو ریشماں کے روپ میں اُس کی بیوی بنی ہوئی تھی۔ اسی طرح "ٹٹیا تارا" کا مرکزی کردار "گاما" ہے جو ایک جھوٹے پیر "جھمر سائیں" کی باتوں میں آکر جھنڈے شاہ بن بیٹھتا ہے اور اپنے اُستاد کے بتائے راستے پر چلتے ایک نوجوان عورت کو بیٹا دینے کے لیے مشتر کہ چلہ کاٹتا ہے لیکن عین اسی وقت جب اُس کے جسم سے چنگاریاں اُٹھ رہی ہوتی ہیں اسے اپنی حقیقی بہن "پینو" کا خیال آجاتا ہے اور وہ اس دوشیزہ کو بہ حفاظت گھر پہنچانے کے لیے اس کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ جب یہ دونوں "جھمر سائیں" کے ڈیرے کے قریب سے گزرتے ہیں تو ڈیرے سے ایک سایہ سا نکلتا ہے۔ یہ سایہ اس کی بہن "پینو" کا تھا جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور قمیض کندھوں سے جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح "منیر انجم" کے افسانے "شیشہ" میں بھی زندگی کے حوالے سے ایک ایسا ہی آئینہ دکھایا گیا ہے۔

پاکستانی پنجابی افسانے میں جنسیت کو موضوع کے اعتبار سے جیسے شروع میں تقسیم کیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ کچھ افسانے ایسے بھی لکھے گئے ہیں جو صرف جنسی لذت کے حامل ہیں اور اس سے مراد وہ افسانے تھے جن میں جنس کو کسی مجبوری کے ساتھ جوڑنے کی بہ جائے بغیر کسی وجہ یا دلیل کے صرف اس لیے موضوع بنایا گیا ہے کہ زندگی کے اس پہلو میں دوسرے اعضا کی نسبت زیادہ کشش ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر کچھ لوگ ادبی اخلاقیات کا حوالہ دے کر یہ جواز بھی پیش کرتے ہیں کہ ادبی اخلاقیات، سماجی اخلاقیات سے الگ ہوتی ہے لیکن اس طرح سوچنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ فنکار ادب کو سماج سے الگ سمجھتا ہے کیوں کہ اگر ادب عام عوام کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے اور معاشرے پر اثر انداز ہونے کی اہلیت رکھتا ہے تو پھر ادبی اخلاقیات کا معاشرے پر اثر انداز ہونا ایک لازمی امر بن جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ جنس کی اہمیت کے ہزار پہلو ہیں اور اسے انسانوں کی بنیادی ضروریات سے اس لیے الگ نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرے کی ساری بقا کا دارومدار اسی پر ہے تو جس طرح غذا انسان کے جسم کے لیے ضروری ہے اسی طرح جنس روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے۔ لیکن یہ صرف اسی صورت ممکن ہے جب اس کا استعمال جائز اور مناسب طریقے سے کیا جائے نہیں تو منفی استعمال جنسی مغالطے اور قلب اور ذہن کی کئی الجھی ہوئی بیماریوں کا موجب

بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جنس جہاں ایک تعمیری قوت ہے وہاں اس کا تخریب کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے۔(۱۴) مثلاً جمیل اختر کے افسانے "جوٹھ" کی طرح محمد اسلم کے افسانے "بھکھ دی کھیڈ" میں بھی پڑھنے والا ماسٹر کے حوالے سے ٹیوشن پڑھنے والی لڑکی کے منفی جنسی جذبوں سے مزا لینے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں کرتا۔ عائشہ اسلم کے افسانوں کے مجموعے کتاب داناں اے۔ آپ بیتی اور خود کلامی کا انداز اختیار کر کے فلسفیانہ باتیں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اکثر کردار پاگل ہیں یا پاگل ہو گئے ہیں یا دوسروں کو پاگل سمجھتے ہیں اور ہر کہانی مردوں کی جنسی بھوک کو تنقید کا نشانہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ ظفر اقبال ڈوگر کے افسانے "پیوند" اور اسد مفتی کے افسانے "لالونائی" میں بھی شہوت اور جسم کے حوالے زیادہ ہیں۔ یہ آزاد مغربی ماحول کو سامنے رکھ کے مغرب کی جنسی آزادی کو طنز کی بہ جائے تلذّذ اور تفریح کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ غلام مصطفی بسمل کے افسانے "ہاسے تے پیڑاں" اور "چورگھرا" بھی نئے ماحول کی روشنی میں کچھ اسی طرح کا منظر پیش کرتے ہیں۔ "چورگھرا" میں فحش لٹریچر کو بنیاد بنا کر ایک جوز از مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور "ہاسے تے پیڑاں" میں کہانی دلیل کے ساتھ آگے نہیں بڑھتی اور جنسی مزے کے حوالے سے نتیجہ پہلے نکال کر اس کے ارد گرد افسانے کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حال آں کہ حنیف چوہدری دے افسانے "وتھاں" میں بھی اسی طرح کے حالات دکھائے گئے ہیں لیکن تاثر کے اعتبار سے اس میں پچھتاوے اور دُکھ کا رویہ کافی گہرا ہو کے سامنے آتا ہے۔ اسی طرح حنیف باوا کے افسانے "مکھی مار" میں بھی جنسی غلط کاری کو صحیح علامتی رنگ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو ان کاموں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جنسیت کے اسی موضوع کے حوالے سے اکبر لاہوری کی کہانی "ماں" ہے جس میں ایک عورت فروخت ہوتی ہوئی اس بازار جا بیٹھتی ہے لیکن آخر میں اپنا سب کچھ لٹا کر دوسرے محلے کے ایک آدمی کے ساتھ نکاح پڑھ لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے یہاں چاہے وہ بہت تنگ ہے لیکن یہ تو ہے کہ مجھے ماں، بہن یا بھابی سمجھا جاتا ہے جب کہ اُس بازار میں جس لڑکے میں مجھے اپنے بیٹے کی شبیہ نظر آتی تھی اس نے بھی ایک دن پانچ روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا کے دوسرا ہاتھ غلط جگہ پر ڈال لیا تھا۔

تلذّذ کے حوالے سے مشتاق باسط کے افسانے "ایہہ کوئی غیرتے نئیں" میں سفید پوش طبقے کی ایک لڑکی "روبینہ" اور افضل احسن کے افسانے "دن دا چانن" میں ایک پورے خاندان کو چھپ چھپا کر پیشہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح آغا اشرف کے افسانے "چُسکی"، "کانگڑی" اور "کھنباں" میں بھی جنس کے بازاری استعمال کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔ جیسے "کانگڑی" میں بیٹوں، بہنوں کا جسم بیچ کر دولت مند بننے کی خواہش رکھنے والے ایک کنبے کی کہانی بیان کی گئی ہے جب کہ "چُسکی" میں "مایاں" کنجری

اور "ماجھے" آم بیچنے والے کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زبان کے چٹخارے اور فن کاری کے درست استعمال سے ان افسانوں میں دل چسپی کا عنصر بھی بڑھ گیا ہے۔ ایک آم کے بارے "ماجھے" اور "گامن" کے مکالمے دیکھیں:

"اوئے ماجھیا ایہہ تے داغی اے۔ گامن نے آکھیا ایہہ ویکھ داغ"

"واہ جی واہ ایویں میری ہوا پئے خراب کر دے او۔ ایہہ داغ نئیں کوئل دے بوسے دا نشان اے۔ ماجھے نے آکھیا۔"

"گامن شاعر سی ایہہ سندیاں ای پھڑک پیا تے کہن لگا۔ ماجھیا تول دے دو سیر کوئل دے بوسے"(۱۵)

اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی پنجابی افسانے ہیں جو رومانی رنگ سے شروع ہو کے جنسی جعلسازی اور فریب کاری پر ختم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور پر ان کے آخر میں کوئی خوفناک انجام دکھا کر اصلاح کی طرف توجہ دینے کی کوشش بھی کی گئی ہوتی ہے لیکن ایک عام فہم انداز کی وجہ سے اصلاح کا ایسا زاویہ رومانی جنس نگاری کے بوجھ نیچے آ کے رہ جاتا ہے۔ جیسے ظفر اقبال ڈوگر کے افسانے "اڈیک"، ڈاکٹر رفعت لاشاری کے افسانے "کالا پتھر"، ایم ڈی شمس کے افسانے "ناجی" احمد مشتاق باسط کے افسانے "اوہ جھل مٹیار" میں ایسی صورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ رفعت کا افسانہ "چنی" بھی رومانوی رنگ سے شروع ہوتا ہوا جنسی جعلسازی پر ختم ہوتا ہے۔ "مریاں" اپنے گاؤں سے شہر پڑھنے آتی ہے جہاں وہ کبھی "عارف" کو مخلص سمجھ لیتی ہے تو کبھی "منظور" کو۔ آخر کار ان دوستوں کے ہاتھوں استعمال ہونے کے بعد وہ اسے ہی بلیک میل کرنے لگ جاتے ہیں۔ عبیدہ اعظم نے مختصر اور منی کہانیوں کے ذریعے عورتوں کے مسئلے بیان کرتے ہوئے رومانی انداز اختیار کرنے کے علاوہ انسانی شکل میں پیدا ہونے والے ان حیوانوں کو بھی بے نقاب کیا ہے جو ہوس کو عشق کے پردے میں چھپا کر جوان ہونے والی کلیوں کے جذبوں اور حسرتوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔

کچھ افسانے جنسی جرائم کے حوالے سے بھی تخلیق کیے گئے ہیں جیسے بشارت حسین کا "سکے تیلے" یا غلام مصطفی تبسم کے "تتیاں پیڑاں" اور "چور تے سادھ" وغیرہ۔ بسمل کے ان دونوں افسانوں میں مذہبی اور جنسی حوالے سے آدمی کا ظاہر اور باطن دکھایا گیا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے دیکھا جائے تو عبدالمجید بھٹی کا "بھولی"، زاہدہ بٹ کا "راکھا"، ایم اے علی کا "کچیاں کندھاں" اور سید خورشید اعظم زاہدی کا "علاج" قابل غور افسانے ہیں کیوں کہ ان میں جنس کے فطری تقاضوں کو سامنے رکھ کر نیم جذباتی اور فکری سطح پر اس کی

اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح شمس نعمان کے افسانے "ویلے دا کھنگر" بھی جنسی حقیقت نگاری پر مشتمل ہے جس میں حاکم دین کی جنسی سوچ اس کی فکر کا حصہ بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سید نصیر حسین شاہ کے افسانے "لاحول ولا" میں بھی ایک مذہبی آدمی کی جنسی ضرورتوں کی کشش کو بھرپور انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔

بابو جاوید گرجاکھی (۱۹۴۷۔۲۰۱۶ء) کے افسانوں میں کئی جگہوں پر جنس بہ راہ راست موضوع بنتی ہے اور بعض جگہوں پر اسے تمثیلی اور علامتی حوالے سے استعمال کیا گیا ہے مثال کے طور پر "کھوٹی چوانی" میں جنسی علامت نگاری سے کام لے کے ایک جوان لڑکی کے غریب اور بوڑھے باپ کو کہانی کے مرکزی کردار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ٹافیاں بیچ کے زندگی گزارنے والے اس بابے کو ایک دفعہ کوئی گاہک جعلی "چوانی" دے جاتا ہے جو سانپ کے منہ میں چھچھلی بن کے بیٹھ جاتی ہے۔ بابا جب بھی اسے کسی اور کو دینے کی کوشش کرتا ہے آگے سے نہ صرف چوانی واپس کر دی جاتی ہے بل کہ بے عزتی بھی ساتھ کی جاتی ہے کہ سفید بالوں کے ساتھ دن کی روشنی میں اس طرح کی جعلی "چوانی" دیتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی۔ آخر کار ایک کردار بابے کو آکے بتاتا ہے کہ جعلی "چوانی" دن کی روشنی میں کسی نے نہیں لینی۔ رات کے اندھیرے میں کسی کو دوگے تو چل جائے گی۔ تھوڑا وقت گزرنے کے بعد ایک دن اسی کردار کو بابا بڑے اچھے لباس میں ملتا ہے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کے کہنے پر آج کل میں جعلی "چوانی" چلا رہا ہوں جو دن میں واقعی نہیں چلتی اور صرف رات کو ہی چلتی ہے۔ بابے کے اس فقرے اور اس کے رہن سہن سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس نے "چوانی" نہیں بل کہ "جوانی" چلا دی ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانے "مجبوری" میں "تاجا" شہر جا کے چار پیسے کمانے کے لیے اپنی کنواری بہن کو پیسے بنانے والی مشین کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ "سزا" ایک چھوٹا سا افسانچہ ہے جو واقعے کے انداز میں پیش کر کے معاشرے پر ایک گہری طنز کی صورت، حکایت کے رنگ میں تخلیق کیا گیا ہے۔ "نوراں" اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جس نے جوانی کے وقت ایک بدمعاش سے عزت بچانے کے لیے شور ڈال دیا تھا۔ شور ڈالنے سے اس کی عزت تو بچ گئی لیکن وہ لوگوں کی نظروں میں بھی آگئی۔ آج وہی کنواری "نوراں" اپنے سفید بالوں کی طرف دیکھ کے سوچ رہی ہے کہ اگر وہ اُس وقت شور نہ ڈالتی اور اپنے آپ کو وقت کے حوالے کر کے اس بدمعاش کو چپ چاپ ہی ہوس کی آگ بجھا لینے دیتی تو رات کے اندھیرے نے اُس کا عیب بڑی

آسانی سے چھپالینا تھا اور آج اُس نے بھی اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ ہنس کھیل رہا ہونا تھا۔ ”عبدل“ میں معاشرے کی اصلاح کا نعرہ لگانے والے جھوٹے ٹھیکیداروں پر طنز کیا گیا ہے اور منٹو کے جنسی رویے کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کون ہے جو آگے بڑھ کے جسم بیچنے والی کسی عورت کو خاوند کا تحفظ فراہم کرنے کے ہمت رکھتا ہے۔ ”ٹھیڈا“ میں بھی ایسے موضوع کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(۱۶)

ملک شاہ سوار علی ناصر کے افسانے ”رشتے“ میں فیکٹری منیجر جمیل ایک غریب اور بے آسرا لڑکی ”شبانہ“ کو بہن بنالیتا ہے اور بڑے عرصے تک اس رشتے کا تقدس قائم رکھنے کے بعد ایک دن اُسے کار میں بیٹھا کر گھر لے جانے کی بہ جائے جنگل کی طرف لے جاتا ہے۔ ”آگ“ میں مشرقی تہذیب میں رچے بسے ڈاکٹر آصف کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو خود ایک غلط لڑکی کے فریب میں آکر گناہ کی دلدل میں جا پھنستا ہے اور اُس کی بیٹی ”صفیہ“ اپنا ہم سفر ڈھونڈ کر گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ مشتاق باسط کے دو اور افسانوں ”کچیاں کندھاں“ اور ”کانگ“ میں بھی جنس، جوانی اور تلذذ کے حوالے سے سامنے آتی ہے لیکن یہاں فرق یہ آگیا ہے کہ مصنف نے فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے گہرے واقعات کا جوڑ توڑ ایسی مہارت سے کیا ہے کہ جنسی فعل کہانی کے ماحول سے پھوٹتا نظر آتا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں سلیم خان گمی کے افسانے ”اسارو“ طرح گاؤں میں ہونے والے جنسی جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو دو طبقات کے حوالے سے یہ افسانے جنسی واقعیت نگاری کی مثالیں بھی بن سکتے تھے بشرط یہ کہ رضا مندی کی بہ جائے ”شادو“ تے ”شیداں“ کے جنسی عیوب کے پیچھے کوئی مجبوری کام کر رہی ہوتی۔ جس طرح ان کے ایک اور افسانے ”نذیراں“ میں ہوا ہے کیوں کہ اس میں ان مجبوریوں کا رونا رویا گیا ہے جس وجہ سے جنسی اور اخلاقی جرم جنم لیتے ہیں۔ سعید آسی کے افسانے ”بھُس“ میں تفاوت کیا گیا ہے۔ مارکسی لہر کے زیر اثر لکھے گئے جنسی افسانوں کا یہی وہ پہلو ہے جو جنس کے فنون لطیفہ کا حصہ بنا دیتا ہے یعنی مظلوم کردار کے ساتھ ہم دردی کا جذبہ اتنا بھرپور سامنے لایا جاتا ہے کہ ہر طرح کے شہوانی جذبے مانند پڑ جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں یہ مجبوری دو طرح سامنے آتی ہے: پہلی مرد اور عورت کے حوالے سے جس میں عورت مجبور طبقے کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری غریب مزدور یا مزارعے کی بیوی یا بیٹی بہن کے سلسلے میں جاگیر دار اور سرمایہ دار کے جنسی رویے کے حوالے سے۔ جس میں مالک اور مزدور کی بہ جائے مرد اور عورت بنیادی حوالہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً

محمود احمد قاضی کے افسانے "دھواں" میں ملک صاحب اپنے کمی کی بیٹی دیکھ کے للچاجاتے ہیں اور "رحمے" بے چارے کو مجبوراً ملک صاحب کی بات ماننی پڑجاتی ہے۔ کلیم شہزاد (پ:۱۹۵۵ء) کے افسانے "سول میرج" میں بھی چوہدری کا بیٹا "قاصر" اپنے ایک مزارعے انور کی بہن رانو کے ساتھ زیادتی کر جاتا ہے۔ حسین شاہد کے افسانے "اُڈناسپ" میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کمّی کی بیٹی کی عزت کا سوال تھا اُس وقت چوہدری فتح خان یہ مسئلہ پنچائیت میں دھوم دھام سے حل کر رہا تھا لیکن جب بات اپنی بہو کی آئی تو جوتے اُتار کے "جھانے" کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح شوکت اسیر کے افسانے "اُچی اڈاری" میں جاگیردار طبقے کے حوالے سے عورت کو مرد کی ناجائز جنسی خواہش کا شکار ہوتے دکھایا گیا ہے۔ یہاں یہ کام چوہدری "کمالے" کی حویلی میں ہوتا ہے جب کہ ہادی عبدالمنان کے افسانے "ننگی" میں چوہدری اور اُس کا بیٹا مل کر احمد علی مزارعے کی بیٹی کی عزت لوٹ لیتے ہیں اور جب یہ لڑکی خودکشی کرنے کے ارادے سے باہر نکلتی ہے تو بہنوئی کے ذہن میں شیطانی غلبہ سوار ہو جاتا ہے حال آں کہ وہ بے چاری اس کے ساتھ صرف اس لیے چلی تھی کہ اس نے اُسے بہن کہا تھا۔

نعمت احمر کے افسانوں "گشتی" اور "یاداں دا پریس" میں ان عورتوں کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن کو لوگ گشتی یا طوائف کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن ان کی مجبوریوں کی طرف نہیں دیکھتے۔ شہری پس منظر میں تخلیق کی گئی ان کہانیوں میں اولذکر کا مرکزی کردار وہ لڑکی ہے جس کی نابینا بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن روٹی سے بھی تنگ ہیں کہانی کا آخری حصہ دیکھیں:

> "دوپر چھاویں دیوے دی کمبدی لو وچ اِک ہوگئے نیں۔ بوہا کھڑکیا تے اک پرچھانواں تڑف کے وکھ ہو گیا۔ دُوجے پَل باشناتُوں اوپری کلی دی واج آئی۔ باجی! پیسے پہلے لینا فیر آٹے والی دکان بند ہو جائے گی۔ لمے والاں منڈا نوٹ زمین تے سٹ کے چھیتی نال باہر نکل گیا۔ اوہدے پچھے بوہا اک لمی چیک نال بند ہویا جیہڑی سارے شہر وچ گونج گئی۔ ایہہ چیک سی گشتی۔"(۱۷)

اسی طرح "یاداں دا پردیس" میں سونیا جس کا والد وفات پا چکا ہے پانچ بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑی ہے۔ اُس کی ماں مختلف گھروں میں کام کر کے کچھ نہ کچھ کما تو ضرور لیتی ہے لیکن بڑھتی ہوئی مہنگائی کی دیوار اس خاندان کی بھوک اور ضروریات میں روز بہ روز اضافہ کرتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ غلط کردار کی ایک لڑکی صوفیا ایک دن سونیا کو نصیحت کرتی ہوئی کہتی ہے کہ جتنے پیسے تیری ماں ایک ماہ میں کماتی

ہے تمھارا ایک گاہک تمھیں اس سے دوگنا دے جائے گا۔ سونیا غربت کے ہاتھوں مجبور کر "صوفیا" کی بات مان لیتی ہے اور اس غلط رستے پر چل پڑتی ہے۔

علی انور احمد (۱۹۶۳ء) کو پاکستانی پنجابی افسانہ نگاری میں اہم مقام حاصل ہے۔ ایک درجن کے قریب ان کے پنجابی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کئی افسانوں میں جنسیت کے مختلف پہلو دیکھے جاسکتے ہیں جیسے "بجھارت" میں جنس کے رومانوی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار "اشفاق" اور اس کی بیوی ہیں جو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ خاوند دوسری عورتوں کے ساتھ غلط کاموں میں ملوث ہے اور بیوی اپنے ماموں کے بیٹے کے ساتھ۔ جنسیت کے منفی تجربات سے مثبت سبق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے "بے اصولی" میں جنسی جبلت اور جذباتی تلذّذ کو سامنے رکھا گیا ہے۔ "شیشیاں تے حمام" میں جنسی جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "غریب" میں جنسی ضرورت کو بھرپور انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ "ڈاین توں وی بھیڑی" افسانہ بھی جنسی لذت کے حوالے سے ہے۔ "پھاہوی" میں جنسی حوالے سے نفسیاتی پہلو کو دیکھا گیا ہے۔ "تیجی وار" میں مرکزی کردار "نوری" اس کی بیٹی "زرینہ" اور "خیر علی" ہیں۔ جنسی جرم کے حوالے سے خیر علی کی جنسی سوچ کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ "رالاں" میں مرکزی کردار "سردار جی" ہے۔ جنسی لذت کے حوالے سے اس افسانے میں جنس کو خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ "سوکن" میں مرکزی کردار "اکبر" ہے جس کی دو بیویاں ہیں۔ اس میں جنسی ضرورت کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ "جتھے توں گئی سیں۔۔۔" میں "سعدی" اور اس کی بیٹی مرکزی کردار ہیں اور دونوں جنسی حوالے سے غلط راستے پر چل پڑتی ہیں۔ جنسی جرائم کے حوالے سے اگلی نسل کو مثبت سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ "ادھے لُکے لوک" میں مرکزی کردار "نادی" اور "بی" (بیر علی) ہیں جو لوگوں کی نظروں میں درویش فقیر اور بہن بھائی ہیں لیکن جنسی جبلت کے ہاتھوں مجبور ایک دوسرے سے جنسی تعلق قائم کیے ہوئے ہیں۔ "بے سوادی رات" اور "اُچا مراتبا" میں کسی حقیقی مجبوری کی بہ جائے صرف جنسی لذت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "خفیہ اکاؤنٹ" جنسی جرائم کے حوالے سے کہانی ہے۔ "گجھی رمز" میں سوتیلا بیٹا سوتیلی ماں کے ساتھ جنسی جرم میں ملوث ہے۔ "اپنا گڑ" میں جنسی جبلت کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ "واکھ" میں ماں کے جنسی جرائم میں ملوث ہونے کی وجہ سے بیٹی بھی اُسی رستے پر چل پڑتی ہے۔ "سکی ٹیٹ بھین" میں جنسی سوچ کی نمائندگی ملتی ہے۔ "کماد دیاں بلاواں توں ڈریا بندا" میں جنسی جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "پیڑاں" میں جنسی جبلت کی اہمیت کو سامنے رکھا گیا ہے۔ افسانے میں باپ اپنی بیٹی کی شادی اس سے بڑی عمر کے آدمی سے کر دیتا ہے لیکن بیٹی ساری زندگی جنسی ضرورت کے لیے ترستی رہتی ہے۔ "قیاسیے، گویڑیے" جنسی جرائم کے حوالے سے ہے۔ "صدیاں پرانی نویں کہانی" میں پاکیزہ رشتوں

میں جنسی جرائم کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ دُھر اندر لکی عورت" میں جنسی ضروریات کی کشش اور جنسی برائی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اپنے دوسرے کئی افسانوں کی طرح علی انور احمد نے "دھوں مار گئے بندے داالمیا" ، "کلے پٹانیاں" اور "سچیارن" وغیرہ میں تمثیلی اور علامتی انداز میں بھی جنس کو موضوع بنایا ہے۔

جمیل احمد پال(۱۹۵۸ء) کے اب تک چار پنجابی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں واپسی داسفر، منی پلانٹ، اکلاپے دا جنگل اور مینڈل دا قانون شامل ہیں۔ ان کے کئی افسانوں میں بھی جنسیت کے گہرے نمونے موجود ہیں جیسے "رُسی ہوئی بیوی" میں مرکزی کردار "خاور" ہے جو دوسروں کی ناراض بیویوں کے ساتھ جنسی جرائم میں ملوث ہے لیکن اپنی بیوی کی ناراضی پر آنکھیں بند کیے ہوئے ہے۔ منفی جنسی تجربات سے تمثیلی انداز میں مثبت جنسی تجربات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "مائی سرداراں" میں جنسی جبلت کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں جس میں مرکزی کردار بھی "مائی سرداراں" ہی ہے۔ "بدام" میں مرکزی کردار "رفیق" اور "مُنی" ہیں۔ جنسی لذت اور جنسی جبلت کو موضوع بناتے ہوئے جنسی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں پر طنز کیا گیا ہے جو دوسری عورتوں کے ساتھ جنسی جرائم میں ملوث ہیں لیکن اپنی بیوی کی جنسی ضرورت پوری نہیں کرسکتے۔ "چھاں" میں مرکزی کردار "قمر" ہے جس کے ساتھ بس میں ایک آدمی غلط حرکات کرتا ہے اس میں جنسی جرم کو موضوع بنایا گیا ہے اور نفسیاتی پس منظر میں جنسی برائی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "گاں" اصل میں دو دوستوں "اسلم" اور "اکمل" کی کہانی ہے۔ مرکزی کردار اکمل کی بیٹی "ماریہ" ہے جو بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ اسلم اپنے دوست اکمل کو اس کی فوراً شادی کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی خوب صورتی سے تمثیلی انداز میں جنسی ضرورت کو موضوع بنایا ہے۔ "اُدھار" میں "راشدہ" اپنے بیٹے "وکی" کو اپنی ہمسائی "یاسمین" کے ساتھ غلط سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ نفسیاتی حوالے سے جنسیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "رابعہ" افسانے میں مرکزی کردار "منصور" اور "رابعہ" ہیں۔ اس کہانی میں سماجی اور معاشرتی حوالے سے ایک منفرد موضوع کو جنسی حوالے سے سامنے لایا گیا ہے۔ جنس کے منفی تجربے سے مثبت سبق حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ "رابعہ" جو کبھی "منصور" کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اچانک اس کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور معاشرے اور خاندانی دباؤ کی وجہ سے جنسی جرم کا ارتکاب کرلیتی ہے۔ جب "منصور" اُس سے اپنے اوپر مہربان ہونے کی وجہ سے پوچھتا ہے تو وہ یوں جواب دیتی ہے:

"منصور! میریاں دو دھیاں نیں۔ میری زندگی دن بدن مشکل ہوندی جارہی اے۔ سس نوں پوترا چاہیدا اے۔ اوہ پوترے لئی میرے خاوند نوں وی ون سوتے مشورے دیندی اے۔ دُوجا ویاہ کرن لئی آکھدی اے۔ تیرے تِن پتر نیں۔ میں سوچیا، تیرے نال اک واری سوں ویکھاں، کیہ پتا ایہدے نال ای رب میرے اُتے مہربانی کر دیوے تے میرے گھر وی پتر جم پوے۔" رابعہ نے گلی گچ اواز نال آکھیا تے دوجے پاسے مونہ پھیر لیا۔"(۱۸)

کرامت مغل(۱۹۷۹ء) اکیسویں صدی کے پنجابی افسانے میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں میں تتلی، ویلے کویلے، توں، کہانی تے میں، بھائی چارے والا گھر اور پُٹھے ٹردے لوک شامل ہیں۔ ان کے کئی افسانوں میں بھی جنسیت کے واضح نمونے ملتے ہیں جیسے "بھُکھا" میں تمثیلی انداز میں جنسی ضرورت بارے بات کی گئی ہے۔ "اک سُر" میں جنس کے منفی تجربے سے مثبت سبق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "آخری عورت" میں مرکزی کردار "تیمور" اور "مس انیلا" ہیں جس میں جنسی جرم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "نکھڑا" میں مرکزی کردار "پروفیسر وقار" ہے۔ اس افسانے میں جنسی جرائم کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "ہمیشہ انج ای ہوندا اے" میں جنسی برائیوں بارے بات کی گئی ہے۔ سرمایہ دار یا چوہدری اپنے ملازموں کی مجبوریوں سے کیسے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کے جنسی رویے بارے بات کی گئی ہے۔ "حاجن تے حاجی" میں جنسی لذت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "کارستانی" میں بھی معاشرے میں پھیلی جنسی برائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ "سندری" میں تمثیلی انداز میں جنسیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "یردا" میں جنسیت کے منفی اثرات کو موضوع بنا کر مثبت سبق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "اُچابول" میں جنسیت کے نمونے موجود ہیں۔ "بے فکری" میں جنسی جبلت کے ساتھ ساتھ جنسی برائیوں کو تمثیلی انداز میں موضوع بنایا گیا ہے۔ بیوہ ہوئی خواتین کی جب شادی نہیں ہوتی تو وہ جنسی جبلت کو کیسے پورا کرتی ہیں اور جنسی حوالے سے اُس پہلو کو اُجاگر کیا گیا ہے جس میں امیر لوگ بڑی عمر کی عورتوں کی بہ جائے چھوٹی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا پسند کرتے ہیں۔ "اک کال دی مار" میں معاشرے میں پھیلی جنسی برائیوں، جنسی تلذذ وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "پٹھے ٹردے لوک" میں "فرزانہ" مرکزی کردار ہے۔ جسے اُس کے کئی قریبی رشتے دار جنسی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش میں ناکام ٹھہرتے ہیں۔ جب "فرزانہ" اپنی مرضی سے اپنے سہیلی کے خاوند کے ساتھ چلی جاتی ہے تو یہی رشتے دار اُس کی پچھ پرتیت ایسے کر رہے ہوتے ہیں جیسے انھیں اس کی بڑی فکر اور دُکھ ہو اور وہ اس سے بڑے مخلص

ہوں۔ جنسی جرائم، جنسی برائیوں، جنسی لذت اور جنسی نفسیاتی پس منظر سب کچھ اس افسانے میں موجود ہے۔ ”گندھیلا“ میں جنسی لذت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ”مڑھکومڑھکی“ میں جنسی جرم اور جنسی لذت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جنسی برائی میں ملوث ہو کر جب ایک عورت پانچ سو روپے کماتی ہے اگر وہ ہی گم ہو جائے تو اُس کو کتنا دکھ لگتا ہے اس کہانی میں ایسے دکھائی دیتا ہے:

> ”مینوں اوس پنج سو دے نوٹ دے چوری ہوون دا ڈاڈھا دُکھ اے۔ مینوں بڑی پیڑ ہوندی پئی اے۔ اوہ دوویں لتّاں کھلار کے کملیاں وانگوں بیٹھی ہوئی سی۔
>
> غم تے دُکھ نے لگدا اوہدا لک ای توڑ دتا اے۔
>
> ہاں بھیناں! مڑھکومڑھکی ہو کے حق حلال دا کمایا ہویا پنجاہ روپیا کھڑ تیج جاوے تاں پیڑ ہوندی اے۔ ایہہ تاں فیر پورے پنج سو روپے سن، گوانڈھن ہمدردی جتائی سی یاں شاید اوویں ای گل کیتی سی۔
>
> گوانڈھن نوں نہیں سی پتاہ او نہیں سی جاندی، صرف اوہنوں پتا سی، صرف اوہ جاندی سی کہ او پنج سو روپیا اوہنے اپنی بت توں ودھ بھار چک کے تے ”وہواچر“ چک کے بڑا اوکھیاں ہو کے، واقعی مڑھکومڑھکی ہو کے کمایا سی۔“(۱۹)

پروین ملک (پ:۱۹۴۶ء) کے افسانے ”ذات برادری“ میں جاگیر یا سرمایہ دار کے جنسی رویے بارے بات کی گئی ہے۔ یہ کہانی معاشرے کے کئی پہلو بیان کرتی ہے لیکن ایک بڑا پہلو جنسی ہوس کے حوالے سے ہے۔ چودھری کا بیٹا ”جمیلاں“ کی بیٹی ”چھیما“ سے غلط کاری کرتا ہے تو چودھری ان کی دادرسی کی بہ جائے اپنے طور پر ہی اس سے نکاح کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سعیدہ یونس کے افسانے ”ارام دی زندگی“ میں بھی چودھری کا بیٹا موچن لڑکی کو جنسی استحصال کا شکار کرتا ہے اور وہ لڑکی جب اپنے وسیب میں جاتی ہے سب اُسے ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ موچن لڑکی اپنی بدنامی سے بچنے کے لیے پھانسی لے لیتی ہے۔ عبید سید کے دو افسانوں میں جنسیت کے واضح نمونے موجود ہیں۔ پہلا افسانہ ”بھلیکھا“ ہے جو رومانی رنگ سے شروع ہو کر جنسی ٹھگی پر ختم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اپنی جنسی ہوس بجھانے کے لیے لڑکی کا جنسی استحصال کر دیتا ہے۔ دوسرا افسانہ ”اکو راز دار“ ہے۔ جس میں جنسی استحصال اور جنسی جرائم کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ”نعمان“ جاگیرداروں کا بیٹا ہے جو ”شادو“ کو اپنے جال میں پھنساتا ہے اور پھر اُس کی عزت برباد کر دیتا ہے۔ بابر جاوید ڈار کے افسانے ”سر دا سائیں“ میں جنسی جرم کو موضوع بنا کر مثبت سبق حاصل کیا گیا ہے۔ فضل احمد خسرو کے افسانے ”کوٹھا“ میں مرکزی کردار ”جہاں زیب“ ہے جو اب بڑھتی عمر کے ساتھ ”جہاناں“ بن گئی ہے۔

جنسی نفسیاتی پس منظر میں منفی جنسی تجربات سے مثبت سبق حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مسعود چودھری(پ:۱۹۴۵ء) کے افسانے "رانی اوس بازار دی" میں تقسیمِ ہند کے حوالے سے ایک لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے، اس میں بھی بڑا پہلو جنسی جرائم کا نظر آتا ہے۔ افضل توصیف کے افسانے "اینٹ آباد دیاں کڑیاں" میں دوسرے شہر میں آئی لڑکیوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو اوباش لوگوں کے نرغے میں آجاتی ہیں اور جنسی استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ جنسی جرائم اور جنسی برائیوں کے گہرے نمونے اس افسانے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ عرفان احسن پاشا کا افسانہ "کالے دی کاٹ" جنسیت زدا سوچ کے حوالے سے ہے۔ اسماء مغل کا افسانہ "خالو، بلاتے چُنی" اور یاسمین حمید کے افسانے "زہریلا" میں جنس اور خوف کو موضوع بنایا گیا ہے۔ محمد آصف خان (۱۹۲۹۔۲۰۰۰ء) کے تین افسانوں "مولوی عبدالقدوس"، "گواچی گاں" اور "دوچھڑے" میں بھی جنس کو موضوع بنایا گیا ہے۔(۲۰)

نورالعین سعدیہ کے افسانوی مجموعے باریاں میں جنسیت کے حوالے سے کئی افسانے شامل ہیں جیسے "کالا کپڑا" میں جنسی جرائم کے حوالے سے کہانی موجود ہے۔ پورے محلے کا معزز آدمی جسے سارے عزت سے "ماموں" کہتے ہیں "سائرہ" کو ہوس کا نشانہ بناتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ "سائرہ" کی ماں کے ساتھ بھی غلط تعلق رکھتا ہے۔ "ہٹی" جنسی لذت کے حوالے سے افسانہ ہے جس کا مرکزی کردار "بے بے چوانی" ہے۔ "ویلا عمر کھا جاندا اے" کا مرکزی کردار "مزہ" ہے۔ جس میں جنسی جرائم کے حوالے سے قریبی رشتوں کا باطن دکھایا گیا ہے۔ "عادت" اور "پناہ" میں کہانی رومانوی رنگ سے شروع ہوکر جنسی ٹھگی پر ختم ہوتی ہے۔ اسی طرح "حیاتی کوڑا سچ" میں جنسی فعل پھوٹتا نظر آتا ہے۔ رائے محمد خاں ناصر (پ:۱۹۵۹ء) کے افسانوی مجموعے سُورتاں میں شامل افسانے "کوس کوس" میں جنس تمثیلی اور علامتی انداز میں سامنے آتی ہے۔ انسانوں اور جانوروں میں جنسی بھوک کی مماثلت کا گہرا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

پاکستانی پنجابی افسانے میں جنسیت کی روایت میں افسانہ نگاروں نے جنسی افسانے کے سفر میں تہذیبی شعور سے روشنی حاصل کرکے اس صنف کو نئے امکانات سے روشناس کیا۔ اس حوالے سے پنجابی افسانہ نگاروں کا استعاراتی بیان، پیچیدہ تجربات زندگی کے پوشیدہ حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر پنجابی افسانوی ادب میں جابجا طوائف اور جنس کا ذکر ملتا ہے۔ عورت کے استحصال کے ساتھ ساتھ کئی جگہوں پر جنسی حوالے سے مردوں کے استحصال کی نمائندگی بھی کی گئی ہے۔ جنسی جبلت، جنسی نفسیاتی پس منظر، جنس کے رومانوی پہلو، مثبت پہلو، منفی پہلو، جنسی لذت، جنسی ٹھگی اور جنسی جرائم جنسیت کے وہ اہم عناصر ہیں جو بھرپور طریقے سے پاکستانی پنجابی افسانے میں سامنے آتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سدرہ اختر، اردو افسانے میں جنس کی روایت، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۸ء)، ۹۔

(۲) محبوب اعلیٰ قریشی، اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ، (نئی دہلی: تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۳ء)، ۱۵۴۔۱

(۳) احمد دہلوی، (مرتبہ)، فرہنگ آصفیہ، جلد اول، (لاہور: مکتبہ حسن سہیل، سن)

(۴) ذوالفقار علی، اُردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان: ۱۹۴۷ء کے بعد، مقالہ برائے ایم فل اردو، (لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، سیشن ۲۰۰۲۔۲۰۰۴ء)

(5) Webster’s Dictionary-England; world publishing company, 1986, 1305.

(۶) وی۔ پی۔ سوزی، طوائف، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۹ء)، ۱۰۰۔

(۷) دیویندر اسر، ادب اور نفسیات، (دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۳ء)، ۱۲۴۔

(۸) عبدالرشید خان، اردو افسانے میں جنسی نفسیات، (سری نگر: گلشن پبلشرز، ۲۰۰۲ء)، ۵۷۔

(۹) ضیا عظیم آبادی، ادب اور جنس، (لکھنؤ: اُردو پبلشرز، ۱۹۷۹ء)، ۱۲۔

(10) Lorth David, *Eroticin Literature*, Western printing Services LTO Bristl, PT.

(۱۱) عبدالرشید خان، اردو افسانے میں جنسی نفسیات، ۳۶۔۳۷۔

(۱۲) انعام الحق جاوید، پنجابی ادب دا ارتقاء، (لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۵ء)، ۴۲۔۴۳۔

(۱۳) شاہد محمود کاشمیری، سرت سویر، (لاہور: عظیم اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)، ۲۸۱۔

(۱۴) انعام الحق جاوید، پنجابی ادب دا ارتقاء، ۴۵۔

(۱۵) آغا اشرف، واورولے، (لاہور: پنجابی ادبی اکیڈمی، ۱۹۶۵ء)، ۱۳۹۔

(۱۶) انعام الحق جاوید، پنجابی ادب دا ارتقاء، ۴۸۔

(۱۷) نعمت احمر، بسنتی، (فیصل آباد: ادارہ ادب و فن، ۱۹۸۵ء)، ۸۲۔

(۱۸) جمیل احمد پال، مینڈل دا قانون، (لاہور: پنجابی مرکز، ۲۰۲۲ء)، ۴۶۔

(۱۹) کرامت مغل، پٹھے ٹُردے لوک، (لاہور: رویل پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۲۷۔

(۲۰) کرامت مغل، کہانی دا سفر (انہویں صدی دے مڈھلے ۱۵ ورھے)، (لاہور: زرتا پبلشرز، ۲۰۱۵ء)، ۲۴۔۲۴۳۔

BIBLIOGRAPHY

- Abdul Rasheed Khan, *Urdū Afsāny Me̱n Jinsi Nafsiāt,* (Sirinagar: Gulshan Publishers, 2002).
- Agha Ashraf, *Vāver Waly*, (Lahore: Punjabi Adabi Academy, 1965)
- Ahmad Dehlawi (Comp.), Farhang-e Āsfia, (Lahore: Mataba Hasan Suhail).
- Devendra Sir, *Adab aur Nafsiāt*, (Delhi: Maktaba Shahrah, 1963)
- Inam ul Haq Javed, *Punjābī Adab Dā Irtaqa*, (Lahore: Al-Faisal Nashran, 2015).
- Jameel Ahmad Paal, *Mendal Dā Qanūn*, (Lahore: Punjabi Markaz, 2022).
- Karamat Mughal, *Kahānī Dā Safar: Ūnnīsvīṉ Sadī Day Mudhlay 15 Warhay*, (Lahore: Zarta Publishers, 2015)
- Karamt Mughal, *Pathay Turday Lok,* (Lahore: Rovail Publications, 2019).
- Lorth David, *Eroticin Literature*, Western printing Services LTO Bristl, PT.
- Mehboob Ahla Qurashi, *Urdū Masnavion Me̱n Jinsi Talazūz,* (New Delhi: Taleeqkar Publishers, 1993).
- Naimat Ahmar, *Basantī*, (Faisalabad: Idara Adab-o Fan, 1985).
- Shahid Mahmood Kashmiri, *Sart Savair*, (Lahore: Azeem Acedemy, 1989).
- Sidra Akhtar, *Urdū Afsāny me̱n Jins Kī Rawāyat,* (Islamabad: Purab Acedamy, 2018).
- V.P. Suzi, *Tavāif*, (Karachi: City Book Point, 2009)
- *Webster's Dictionary-England*; world publishing company, 1986.
- Zia Azeem Abadi, *Adab aur Jins*, (Lakhnaw: Urdu Publishers, 1979).
- Zulfiqar Ali, *Urdū Safarnāme̱n Me̱n Jins Nigārī Kā Rujhān: 1947 K Bād,* MPhil Urdu Thesis, (Lahore: Punjab University Oriental College, 2002-2004)

❖❖❖